حکمتِ اقبال (۳۷)

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

خودی اور آرٹ (۲)

منکرِ خدا کا آرٹ

جو شخص اپنی آرزوئے حسن کی تشفی کے لیے خدا کے تصور سے کام نہیں لے سکتا، اس لیے کہ وہ خدا کا منکر یا کافر ہے یا خدا کے تصور سے آشنا نہیں، اس کا آرٹ اسی گھٹیا قسم کا آرٹ ہو سکتا ہے، اگرچہ وہ دیکھنے والوں کے لیے فردوسِ نظر ہو اور وہ یہ محسوس کرنے لگیں کہ اس آرٹ نے ان پر جنت کا ایک دروازہ کھول دیا ہے اور خدا کی قدرت کے رازہائے سربستہ ان پر آشکار کر دیئے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ خودی کی تگ و دو سے مادی طور پر ترقی یافتہ بن جانا یا اس جہانِ سحر و شام کے ادوار میں سے دورِ جدید کا انسان بن جانا ایسے کارہائے نمایاں بھی حق و باطل اور زشت و زیبا کی اس حریفانہ کشمکش سے، جو انسانی زندگی کی ایک خصوصیت کے طور پر انسان کے ضمیر کے اندر اور باہر جاری ہے، انسان کو نجات نہیں دلا سکتے۔ اس سے نجات پانے کا طریق صرف یہ ہے کہ انسان خدا پر ایمان لائے اور خدا کی محبت کو ترقی دے کر کمال پر پہنچائے۔ اس زمانہ کے کافر نے ایک نئی قسم کی بت پرستی کو، جس میں لات و منات کی بجائے وطن و قوم اور رنگ و نسل کو اصنام بنایا جاتا ہے، اپنا شعار بنا لیا ہے۔ خدا سے بیگانگی کے اس زمانہ میں اس کافر سے ہم اس سچے آرٹ کی توقع کیسے کر سکتے ہیں جو صرف عشقِ حقیقی سے زندگی پانے والوں کا ہی امتیاز ہے۔ وہ مر چکا ہے اور یہی اس کا آرٹ جو غیرِ حسن کو حسن، موت کو حیات، اور قبر کی تاریک رات کو زندگی کی روشنی سمجھتا ہے اس کا جنازہ پڑھا رہا ہے۔

ہے یہ فردوسِ نظر اہلِ ہنر کی تعمیر
فاش ہے چشمِ تماشا پہ نہاں خانۂ ذات!
نہ خودی ہے، نہ جہانِ سحر و شام کے دَور
زندگانی کی حریفانہ کشاکش سے نجات!

.com
com

آہ! وہ کافرِ بے چارہ کہ ہیں اس کے صنم
عصرِ رفتہ کے وہی ٹوٹے ہوئے لات و منات!
تو ہے میت! یہ ہنر تیرے جنازے کا امام!
نظر آئی جسے مرقد کے شبستاں میں حیات!

انسان کی تمام اعلیٰ سرگرمیوں کا مقصد خودی کی حفاظت اور تربیت ہے

سرود و شعر اور ہنر کی دوسری قسمیں ہی نہیں، بلکہ ادب اور دین و سیاست بھی انسان کے ایسے اعمال ہیں جن کا منبع بندۂ خاکی کا دل یا اس کی آرزوئے حسن ہے۔ یہ اعلیٰ قسم کے اعمال انسان کا خاص امتیاز ہیں اور حیوان کے حصہ میں نہیں آتے۔ ان کا مقصد خدا کی محبت کے اسی جذبہ کی تشفی اور خدمت و اعانت ہے جو انسان کو اشرف المخلوقات اور خدا کا خلیفہ اور ہمراز و ہم کار بناتا ہے۔ ان اعمال کے نتائج اور فوائد میں سے ہر ایک اپنی قدر و قیمت میں ایک نایاب اور قیمتی موتی کی طرح ہے۔ لہٰذا اس میں ذرا شک نہیں کہ ان اعمال کا مقام ستاروں سے بھی بلند تر ہے لیکن اگر ان میں سے کوئی خودی کی (یعنی خودی کی محبت کی جو فقط خدا کے لیے ہوتی ہے) حفاظت اور تربیت نہ کر سکے تو محض بے سود اور بیکار ہے، کیونکہ اس سے زندگی کے مقصد کو اور اس عمل کے اپنے مقصد کو بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اور اگر وہ عمل خودی کی حفاظت اور تربیت کرنے والا ہے تو عین زندگی ہے۔ اس دنیا میں جن قوموں نے اپنے دین اور اپنے ادب کو خودی کی تربیت اور ترقی کے مقصد سے بے تعلق کر لیا تھا وہ ذلیل ہو کر رہی ہیں۔

سرود و شعر و سیاست، کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ!
ضمیرِ بندۂ خاکی سے ہے نمود ان کی
بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ!
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عینِ حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ!

© rasailojaraid.com

ہوتی ہے زیرِ فلک اُمّتوں کی رُسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوتے ہیں بیگانہ!

اگر آرٹ میں خودی کی تعمیر یعنی خدا کی محبت کی نشوونما کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو خواہ وہ مصوری ہو یا شاعری، موسیقی ہو یا گانا، وہ افسوسناک ہے۔ انسان کے لیے زندگی خدا کی محبّت ہے اور موت خدا سے دُوری، لیکن افسوس کہ مکتب ہو یا میکدہ (یعنی آرٹ جو حسن کی نمائش سے مست کرتا ہے) اس وقت دونوں بے خدا ہونے کی وجہ سے موت کا درس دے رہے ہیں۔ ہمیں جینا سیکھنا چاہیے اور اصل جینا خودی کا جینا ہے۔ اگر ہماری خودی زندہ ہو جاتے تو ہم اس دنیا میں بھی زندہ رہیں گے اور اگلی دنیا میں بھی۔ بدن کی زندگی جو شرر کی طرح ایک لمحہ سے زیادہ نہیں ہوتی ہماری اصل زندگی نہیں۔ انسان کی اصل بدن سے نہیں بلکہ روح سے ہے۔ بدن روح سے ہے، روح بدن سے نہیں۔ زندہ رہنے کے لیے ہمیں وجود یا زندگی کے لوازمات اور مقامات و مدارج کو سمجھنا چاہیے۔

اے کہ ہے زیرِ فلک مثلِ شرر تیری نمود
کون سمجھائے تجھے کیا ہیں مقاماتِ وجود
گر ہنر میں نہیں تعمیرِ خودی کا جوہر
وائے صورت گری و شاعری و نائے و سرود
مکتب و میکدہ جز درسِ نبودن ندہند
بودن آموز کہ ہم باشی وہم خواہی بود!

آرٹ کی تاثیر کا منبع

آرٹ یا ہنر کی ساری مشکلوں اور کوتاہیوں کا سبب سمجھنے کے لیے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ جب ایک نَے نواز اپنی نَے سے اثر میں ڈوبی ہوئی مست کرنے والی سُریں نکالتا ہے تو نَے کی آواز میں شراب کا سا سُرور کہاں سے آجاتا ہے۔ یقیناً اس کا منبع نَے کی سوکھی ہوئی لکڑی نہیں بلکہ نَے نواز کا دل ہے۔ تو پھر یہ دل کیا چیز ہے۔ اس میں مست کرنے کی خاصیت اور اثر پیدا کرنے کی طاقت کہاں سے آتی ہے۔ یہی دل انسان کی خودی ہے، جو اصل انسان ہے اور اس دل

میں فقط ایک ہی آرزو ہے اور وہ آرزوئے حسن ہے، جو صرف خدا کی محبت سے مکمل اور مستقل طور پر مطمئن ہوتی ہے۔ عبادت، علم، اخلاق اور ہنر ایسے اعمال انسان کی اسی آرزوئے حسن کے پہلو ہیں اور اسی کی اعانت کے لیے وجود میں آتے ہیں۔ غلط اور ناقص اور نازیبا تصورات زیبائی کا لباس اوڑھ کر خدا کی محبّت کے جذبہ کو اپنی طرف کھینچتے رہتے ہیں لیکن اس کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ یہ غیر اللہ سے کٹ کر بالکل خدا کے لیے ہو جائے۔ اور جب یہ کلیتہً خدا کے لیے ہو جاتا ہے تو انسان کا دل زندہ ہو جاتا ہے اور وہ صحیح معنوں میں صاحبِ دل بن جاتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ صاحب دل کی ایک نگاہ سے شہنشاہِ ایران کا تخت الٹ سکتا ہے اور اس کی نگاہ میں روم اور شام اور اس کی سلطنتوں کی بھی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ جب دل خدا کی محبت سے زندہ ہوں تو قوم بھی زندہ ہوتی ہے اور جب دلوں سے خدا کی محبت رخصت ہو جائے اور دل مردہ ہو جائیں تو قوم بھی مر جاتی ہے۔ دل کی واردات پے بہ پے بدلتی رہتی ہیں کیونکہ اس میں جلال بھی ہے اور جمال بھی۔ جب اس کی محبّت کو رکاوٹوں کا سامنا ہونے لگے تو یہ جلالی صفات کا مظاہرہ کرتا ہے جس سے محبت کی رکاوٹوں کو فنا کر دیتا ہے۔ اور جب اس کی محبت کو موافق حالات پیش آئیں تو یہ حریر و پرنیاں کی طرح نرم ہو جاتا ہے اور سراسر محبّت نظر آنے لگتا ہے۔ اگر ایک فنکار کی ناقص، ناتمام اور راہ گم کردہ محبّت بھی اس کی نَے کے نالوں میں کچھ اثر پیدا کر سکتی ہے تو پھر خود ہی سمجھ لیجئے کہ اگر اس کی محبت اپنے حقیقی محبوب کے لیے ہو گی اور درجۂ کمال پر ہو گی تو اس کے نالۂ نَے میں تاثیر اور مستی کس درجہ کی ہو گی اور اس کا فن عمدگی کے کس مقام پر ہو گا۔ اگر فنکار یہ راز پا جائے تو اس کو فن کی تمام مشکلات کا حل یہیں سے ملے گا۔ اقبال اسی مضمون کو شعر میں بیان کرتا ہے۔

آیا کہاں سے نالۂ نَے میں سرورِ مے ۔۔۔ اصل اس کی نَے نواز کا دل ہے کہ چوبِ نَے؟
دل کیا ہے؟ اس کی مستی و قوت کہاں سے ہے؟ ۔۔۔ کیوں اس کی اک نگاہ الٹتی ہے تختِ کَے؟
کیوں اس کی زندگی سے ہے اقوام میں حیات؟ ۔۔۔ کیوں اس کے واردات بدلتے ہیں پے بہ پے؟
کیا بات ہے کہ صاحبِ دل کی نگاہ میں ۔۔۔ جچتی نہیں ہے سلطنتِ روم و شام و رَے؟
جس روز دل کی رمز مغنّی سمجھ گیا ۔۔۔ سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے!

© rasailojaraid.com

ہنر کے کمال کا معیار

ایک فن کار کے متعلق بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ اہلِ نظر ہوتا ہے، حسن کا ذوق رکھتا ہے اور حسن کو غیرِ حسن سے ممیّز کر سکتا ہے۔ لیکن اگر ایک فنکار خود فن کی حقیقت اور اس کے مقصد سے ناآشنا ہو تو ہم اسے اہلِ نظر کیسے کہہ سکتے ہیں۔ ہنر کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے دل میں خدا کی سچی محبت کا ایسا سوز پیدا ہو جو اس کو زندۂ جاوید بنا دے۔ یہ مقصد اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ ہنر کی تخلیق اس قسم کی ہو کہ وہ خدا کی محبّت کی نشوونما کر سکے۔ اگر فنکار غیرِ حسن کو حُسن بنا کر پیش کرے تو اس کا فن بدن کی اس زندگی میں، جو شرر کی طرح ایک دو لمحہ کے لیے ہی ہوتی ہے، کسی قدر لذّت یا سرور کا باعث ہو تو ہو، لیکن نہ تو وہ خدا کی محبّت کی تربیت کر سکے گا اور نہ ہی روح کی ابدی زندگی اور اس کی محبت کے ابدی سوز کے لیے ممد و معاون ثابت ہو سکے گا۔ لیکن بدن کی اس نفس یا دو نفس کی زندگی کی حقیقت کیا ہے کہ فن کار اپنے فن کو اس کا غلام بنا دے۔ ابرِ نیساں کا قطرہ اگر کسی صدف میں جا پڑے تو وہ گہر بن جاتا ہے۔ فن کار کا جوہر وہ قطرۂ نیساں ہی سہی جو اس کے شاہکار کے صدف کو حسن کے گوہرِ تابدار سے پُر کرتا ہے، لیکن وہ صدف یا وہ گوہر جو قطرۂ نیساں کے کمالات کی تخلیق ہونے کے باوجود دریا میں تلاطم پیدا نہ کر سکے، دریا کے لیے بے حقیقت ہے۔ اسی طرح سے فن کا وہ شاہکار اور فن کا وہ حسن جو قوم کے اندر خدا کی رضامندی کے حصُول کے لیے عمل کی کوئی حرکت پیدا نہ کر سکے، قوم کے لیے بے معنی اور بے کار ہے۔ بادِ سحر سے چمن میں پھول کھلتے ہیں اور یہ صحیح ہے کہ شاعر کی شاعری اور گانے والے کا گانا دونوں چمنِ قوم کے لیے بادِ سحر کا کام دے سکتے ہیں لیکن وہ بادِ سحر بے کار ہے جس سے قوم کا گلستان خدا کی محبّت سے شگفتہ ہونے کی بجائے خدا کی محبّت سے محروم ہو کر مرجھا جائے۔ ایک ایسی قوم جو حالتِ جمود میں ہو، جب تک اس کے لیے کسی معجزہ سے فکر و عمل کی نئی راہیں نہ کھل جائیں، وہ انسانیت کی منزلِ مقصود کی طرف حرکت نہیں کر سکتی۔ ہنر ایسا ہونا چاہیے جو عصائے کلیمی کی طرح ہو، جس کی ایک ضرب سے بے آب و گیاہ بیابان میں پتھر سے پانی کے چشمے پھوٹ نکلے تھے، جو ایک معجزہ کا حکم رکھتا ہو اور ایک حیرت انگیز فکری انقلاب سے قوم کو ارتقاء کے کھوتے ہوئے راستوں پر ڈال سکتا ہو۔ اقبال کہتا ہے:

.com
com

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!

مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا!

جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا، وہ گہر کیا!

شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا!

بے معجزہ دنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا!

خطرناک شاعری

اگر شعر خودی کی آرزوئے حسن کے اصل مقصود کو پیش نظر نہ رکھ سکے تو یہ انسانیت کے لیے نہایت ہی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ یہ فن کی اور قسموں کی نسبت زیادہ آسانی کے ساتھ عوام تک پہنچ جاتا ہے۔ اس سے تھوڑے خرچ پر اور بار بار استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ پھر یہ اظہارِ مطلب کے لیے زیادہ موزوں اور موثر ہے۔ انسانی جذبات کو زیادہ آسانی کے ساتھ اپنے ضبط میں لا سکتا ہے اور ہماری روزمرہ کی زندگی سے بآسانی تعلّق پیدا کر سکتا ہے۔ اگر شاعر مقصودِ حیات سے ناآشنا ہو تو پھر وہ زشتی اور نازیبائی کو حسن بنا کر پیش کرتا ہے، انسان کے ارتقاء کی راہ میں ایک رکاوٹ پیدا کر دیتا ہے، موت کو زندگی اور زندگی کو موت کا رنگ دے کر سامنے لاتا ہے، ایسا زہر تقسیم کرتا ہے جو شہد میں حل کیا گیا ہو بعض اوقات اس کا نقصان حساب سے باہر ہو جاتا ہے کیونکہ وہ لاتعداد انسانوں کی آرزوئے حسن کی غلط راہوں اور غلط منزلوں کی طرف راہ نمائی کر کے ان کو بڑی بڑی مصیبتوں میں مبتلا کر دیتا ہے جن سے وہ مر کر ہی نجات پاتے ہیں۔ ایسے شاعر کا کلام پھول کو تازگی سے اور بلبل کو ذوقِ پرواز سے محروم کر دیتا ہے۔ گویا اس کے اثر سے نہ حسن میں شوخی باقی رہتی ہے اور نہ عشق میں گرمی۔ انسان خیالات کے بحرِ بیکراں میں غرق ہو جاتا ہے اور عمل سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ اس کا کلام شراب کی سی مستی ضرور پیدا کرتا ہے، لیکن ہر انسان کو اپنی خودی کی سلامتی کے لیے اس کی ٹپکتی ہوئی شراب سے بچنا چاہیے۔ جس بدقسمت قوم میں ایسا شاعر پیدا ہو وہ اجل سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔

وائے قومے کز اجل گیرد برات
شاعرش وا بوسد از ذوقِ حیات

خوش نماید زشت را آئینہ اش
در جگر صد نشتر از نوشینہ اش

© rasailojaraid.c

بوسہ اُو تازگی از گل برد | ذوقِ پرواز از دلِ بلبل برد
دریم اندیشہ اندازد ترا | از عمل بیگانہ مے سازد ترا
از خم و مینا و جامش الحذر | از مے آئینہ فامش الحذر

مقدس شاعری

اس کے برعکس اگر شعر خودی کی آرزوئے حسن کے مقصود سے آگاہ ہو تو عالمِ انسانی کے ارتقاء کا ایک مفید اور مؤثر ذریعہ بن جاتا ہے۔ ایسا شعر کہنے والے شاعر کے متعلق اقبال لکھتا ہے کہ اس کا سینہ حسن کی جلوہ گاہ ہوتا ہے جس سے حسن کا نور پھیلتا ہے۔ وہ اپنے شعر سے جس چیز کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس کے حسن میں اضافہ کر دیتا ہے۔ قدرت کا حسن بھی اس کے کلام کے جادو سے اور زیادہ دلکش اور محبوب ہو جاتا ہے۔ اس کا فکر بلندی میں چاند اور ستاروں تک پہنچتا ہے۔ وہ زشتی کو جانتا ہی نہیں اور حسن کو پیدا کرتا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ قافلے اس کی بانگِ درا سے اس کے پیچھے اپنی منزلوں کی طرف چل پڑتے ہیں۔

سینۂ شاعر تجلّی زارِ حسن | خیزد از پہنائے او انوارِ حسن
از نگاہش خوب گردد خوب تر | فطرت از افسونِ او محبوب تر
فکرِ اُو باماہ و انجم ہم نشیں | زشت را نا آشنا خوب آفریں
کاروانہا از درایش گام زن | در پئے آوازِ نالیش گام زن

جس طرح سے دل جسم کے اندر احساسات کا مرکز ہوتا ہے، شاعر ایک قوم کے لیے جذبات اور احساسات کا مرکز ہوتا ہے۔ وہ اپنی محبت کے سوز سے، جو شاعری کی جان ہے، ایک نئی دنیا پیدا کرتا ہے۔ خدا کی محبّت کا سوز کائنات کے ہر ذرّہ میں ہے، اسی سے پوری کائنات کی تعمیر ہوتی ہے۔ وہ شاعری جو اس سے خالی ہے ایک طرح کا ماتم ہے۔ اگر شعر کا مقصود خدا کی محبّت کی بنیاد پر انسانیت کی تعمیر ہو تو وہ نبوّت کا وارث ہے۔

شاعر اندر سینۂ ملّت چو دل | ملّتے بے شاعرے انبارِ گل
سوز و مستی نقشبندِ عالمے است | شاعری بے سوز و مستی ماتمے است

شعر را مقصود اگر آدم گری است
شاعری ہم وارثِ پیغمبری است

لہٰذا اقبال شاعر کو دعوت دیتا ہے کہ وہ زندگی کے مقصد کو اپنے ہنر کا معیار قرار دے۔ اگر اس کی شاعری خدا کی محبّت کو فروغ دینے کے کام آ رہی ہے تو قابل قدر ہے ورنہ نہیں۔

اے میانِ کیسہ ات نقدِ سخن
بر عیارِ زندگی اُو را بزن

اگر ہنر کار کا ہنر خدا کی محبّت کے جذبہ کی عملی تسکین اور تشفی کے لیے کام نہیں آ رہا تو وہ یقیناً قوموں کی بربادی کا سبب بنے گا۔ ایسے ہنر سے گریز واجب ہے۔

نہ خُدا رہے نوا گر تب و تابِ زندگی سے
کہ ہلاکیٔ اُمم ہے یہ طریق نے نوازی!

غلام اور کافر کا آرٹ

چونکہ آرٹ خودی کی آرزوئے حسن کے آزادانہ اظہار پر موقوف ہوتا ہے، ایک غلام یا ایک ایسا آدمی جس کا تصوّرِ حقیقت صحیح نہ ہو اعلیٰ قسم کا آرٹ پیدا نہیں کر سکتا۔ اکثر اوقات اس کے آرٹ کا مقصد یا فطرت کی نقل ہوتا ہے یا ان افراد کے ذوق کی ترجمانی اور خدمت گزاری جن کو یہ آرٹ محظوظ کرنا چاہتا ہے۔

ایک غلام اپنی پوری آرزوئے حسن کے مطابق ایجاد و تخلیق کی اہلیّت سے محروم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی خودی اپنے صحیح تصوّرِ حقیقت کے لیے نہیں بلکہ اپنے آقاؤں کے غلط تصوّرِ حقیقت کے لیے سوچنے اور کام کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کی ایجاد و تخلیق کی قوتیں اپنا آزادانہ اور مکمل اظہار نہیں پا سکتیں۔ اس کا آرٹ جدّت کے وصف سے عاری ہوتا ہے۔ آرٹ حسن کے آزادانہ اظہار کا نام ہے۔ چونکہ غلام کا آرٹ حسن کا آزادانہ اظہار نہیں ہوتا، لہٰذا وہ سچا آرٹ بھی نہیں ہوتا۔ ایک فن کار اپنے آرٹ میں اپنے آپ کا مکمل آزادانہ اظہار اسی صورت میں کر سکتا ہے جب اس کی خودی ہر قسم کے زشت اور ناقص تصوّراتِ حقیقت کے اثر سے آزاد ہو۔ ناقص تصوّراتِ حقیقت جو خودی کی فطرت سے مطابقت نہیں رکھتے، وہ اس کی آزادی کو سلب کر کے

© rasailojaraid.com

اسے اپنا غلام بنا لیتے ہیں، جس کے بعد وہ اپنے آپ سے بیگانہ ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں خودی آزادانہ تخلیق کے قابل نہیں رہتی۔ لہٰذا خدا سے کفر اور غلامی دونوں حالتیں اعلیٰ قسم کے آرٹ کے لیے سازگار نہیں۔ بلند ترین سطح کا آرٹ صرف اسی حالت میں ممکن ہے جب فن کار کی خودی ہر قسم کے غلط تصوّراتِ حقیقت کے اثر سے مکمل طور پر آزاد ہو، خواہ یہ اثر کفر سے پیدا ہو رہا ہو یا غلامی سے۔ غلامی کی حالت میں پیدا ہونے والے فنونِ لطیفہ کے اندر کسی قسم کی بلائیں مخفی ہوتی ہیں غلامی کے ساحرانہ اثرات کا ذکر کیا جاتا ہے، غلام کی فنی مخلوقات اُس کے دل ہی کی طرح بے نور ہوتی ہیں، اُس کی سُریں اُس کے دبے ہوئے دل و دماغ ہی کی طرح پست ہوتی ہیں، اُس کی نَے کی آواز ہی سے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ غلام ہے۔ اُس کا ساز انسانوں کی ایک پوری بستی کے لیے موت کا پیغام ہوتا ہے۔

مرگ ہا اندر فنونِ بندگی — من چہ گویم از فسونِ بندگی
چوں دلِ او تیرہ سیمائے غلام — پست چوں طبعش نواہائے غلام
از نئے او آشکارا رازِ او — مرگِ یک شہر است اندر سازِ او

تنظیمِ اسلامی کی انقلابی دعوت کا نقیب

ماہنامہ میثاق لاہور

زیرادارت: ڈاکٹر اسرار احمد

فی شمارہ -/۵ روپے — سالانہ زرِتعاون -/۵۰ روپے

.com
com